The Muslim Saints of South Asia

by Prof. Anna Suvorova

چادرِ زربفتِ گل فشاں

برصغیر کے اولیاء اور ان کے مزار

اینا سفوروا

روسی سے انگریزی میں ترجمہ: ایم اسامہ فاروقی

انگریزی سے ترجمہ: محمد ارشد رازی

مشعل

MashalBooks.org

ترتیب

تعارف — ارشد رازی

برصغیر میں مزار 7

لاہور کے محافظ اور سرپرست ولی 42

صاحبِ اجمیر 64

پاکپتن کا درویش 86

دلی کا امن کار 106

ملتان کا روحانی تاجدار 131

جنگجو اولیا 154

بے سلسلہ درویش 175

حواشی

MashalBooks.org

تعارف مصنفہ

اینا سووّ رووا روس کی سائنسز اکیڈمی کے اورینٹل سٹڈیز انسٹی ٹیوٹ میں ایشین لٹریچر ڈیپارٹمنٹ کی سربراہ ہیں۔ ہند اسلامی تمدن اور ادب کی اس مسلمہ عالم نے روسی اور انگریزی میں اس خاص علمی میدان میں کئی اہم علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں۔ وہ دنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ہند اسلامی تمدن پر اکثر و بیشتر لیکچر دیتی ہیں۔انہوں نے اردو نثر کے کئی فن پارے روسی زبان میں منتقل کئے ہیں۔ ان کی اہم کتابیں یہ ہیں:

MashalBooks.org

تعارف

جنوبی ایشیا کے مسلمانوں میں اولیا اور ان کے مزاروں کی زیارت ان کی تمدنی زندگی کا خاصا اہم حصہ ہے۔ ان کا مطالعہ جنوبی ایشیا کے باشندوں اور بالخصوص مسلمانوں کے حال اور ماضی کی تفہیم میں یقیناً بہت معاونت کرسکتا ہے۔ اس کتاب میں فاضل مصنفہ نے ہندوستان میں صوفیانہ رجحانات کے بڑے بڑے سلسلوں کے نمائندہ صوفیوں اور عوام میں ان کی طرز پذیرائی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔اس کتاب سے ہمیں پاک و ہند میں درگاہوں کی زیارت اور صدیوں پر محیط اس کے ارتقا پر سادہ زبان میں اچھی معلومات ملتی ہیں۔اس میں برصغیر کے صوفیا پر ہندو متصوفانہ روایات کے اثرات کا اجمالی سا جائزہ بھی موجود ہے۔اس لئے یہاں قاری کو اس طرح کے اثرات اور ان کے ردِعمل میں چلنے والی مذہبی اصلاح کی تحریکوں کے مطالعے کی لئے ایک سادہ مگر اہم بنیاد میسر آ جاتی ہے۔

کتاب کے ترجمے میں ہر دو زبانوں کے وابستگان کے عمومی مزاج کا اختلاف مشکل پیدا کرتا ہے۔ جب کتاب کا تعلق مقدس ہستیوں سے ہو تو یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بہرکیف میں نے مصنفہ کے طرز فکر کو اردو کے اپنے مزاج کے مطابق بیان کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اس ترجمے میں زبان کو سادگی کی ایک خاص سطح پر لانے اور رکھنے میں جناب عمران جاوید صاحب نے میری معاونت کی ہے۔

محمد ارشد رازی

لاہور

MashalBooks.org

پیش لفظ

کرسٹفر شیکل

بنی نوع انسان کے لئے نیا ہزاریہ کئی اعتبار سے ایک نیا زمانہ اور نیا دور ہے۔ایک ایسا دور جب ہم خواہی نخواہی ایک دوسرے کے زیادہ سے زیادہ قریب ہوتے جا رہے ہیں ۔ انسانی فطرت تو جو ہے سو ہے لیکن معاشی رابطوں اور مشینی انداز کے سماجی تعلقات کی بڑھتی ہوئی رنگا رنگی ایک ایسا عمل ہے جو اکثر و بیشتر ان متنوع مذہبی اور ثقافتی روایات کو سمجھنے اور ان کی تحسین کرنے کی ہماری ان صلاحیتوں کو پیچھے چھوڑ دیتا ہے جن روایات کے ساتھ دن رات ہمارا واسطہ رہتا ہے ۔ عام زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ پہلے ہم دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو ایک اطمینان بخش فاصلے پر رکھ کر اپنا تشخص قائم کرتے تھے لیکن اب وہ فاصلہ مٹ گیا ہے ۔ اب وہ ''دوسرے'' یا اجنبی ہمارے بہت قریب آ گئے ہیں ۔انسانی ارتقا کے ابتدائی دور میں ہماری جو جبلت بن گئی تھی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہم اجنبی لوگوں سے ڈرتے تھے۔ اور ان کی قربت کے وقت یہ سوچنے کے بجائے کہ کہ ہم نئے اور مختلف دوستوں سے مل رہے ہیں اور جہاں سے وہ آئے ہیں اس کے بارے میں ہمیں کچھ نئی باتیں جاننے اور سمجھنے کا موقع مل رہا ہے الٹا ان سے خوف کھاتے تھے ۔

باہم مفاہمت کے عمل میں دل و دماغ کا کھلا ہونا بہت ضروری ہے ۔اور اگر ہمیں اس نئے گلوبل معاشرے میں آگے بڑھنا ہے جس کی طرف ہمیں تیزی سے لے جایا جا رہا ہے تو اس کھلے دل و دماغ کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے ۔ لیکن اس افہام و تفہیم کے لئے صرف کھلا دماغ ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے لئے علم کی ضرورت بھی ہے ۔اس حقیقت کا ادراک اس وقت اور بھی ہوتا ہے جب ہم عالم اسلام کے بارے میں عام طور پر پھیلی ہوئی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں دیکھتے ہیں ۔ یہ غلط فہمیاں جہالت اور تنگ

MashalBooks.org

نظری کا نتیجہ ہیں یہی جہالت اور تنگ نظری اسلام کی صحیح تفہیم کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہے ۔پچھلے چند برسوں کے واقعات اس بات کا تقاضہ کرتے ہیں کہ اسلام کے بارے میں دردمندی اور ہمدردی کے ساتھ علمی اور فکری انداز میں غور کیا جائے اور ایسی کتابیں لکھی جائیں جن سے دل و دماغ کے بند دروازے کھلنے کی امید پیدا ہو سکے ۔

پروفیسر اینا سوووروا کی زیر نظر کتاب سوچنے سمجھنے کی ایسی ہی کھڑکی کھولتی ہے ۔ پروفیسر اینا اردو ادب اور جنوبی ایشیا کے مسلم کلچر کی ممتاز روسی اسکالر ہیں ۔۔روسی زبان میں اس کتاب کی بہت پذیرائی ہوئی ہے۔ اس کے بعد مغرب کے قارئین بالخصوص مسلم تارکین وطن کے لئے نظر ثانی شدہ انگریزی ایڈیشن چھاپا گیا ہے ۔کتاب کا موضوع بلا شبہ ثقافتی ا، مذہبی اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے ۔ اگر دیکھا جائے تو پاکستان اور بنگلہ دیش میں اکثریت کی حیثیت سے اور ہندوستان میں اقلیت کے طور پر مسلمان آج کی دنیا میں سب سے بڑا ذیلی گروپ ہیں ۔ بیسویں صدی میں اگر چہ نئی جغرافیائی حد بندیاں کر دی گئی ہیں اس کے با وجود تمام مسلمانوں کی میراث مشترک ہے ۔۔اس کا سلسلہ گیارھویں اور بارھویں صدی تک جاتا ہے جب برصغیر میں مسلمانوں نے اپنے قدم جمائے ۔

اس مشترک میراث کے مرکز میں صوفیائے کرام کی بلند قامت شخصیات نظر آتی ہیں ۔ برصغیر میں اسلام کی ترویج اور فرغ میں ان صوفیائے کرام کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ انہوں نے اپنے زمانے کی مذہبی اور ثقافتی حد بندیوں کو ایسے توڑا کہ ہندو آبادی بھی ان کی گرویدہ ہوگئی ۔صوفیانہ شاعری اور درگاہی روایات نے مقامی آبادی کے دلوں میں ایسا گھر کیا ہے کہ ان کے روحانی فیضان کا چشمہ آج تک جاری ہے ۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے حکمرانوں اور اپنے زمانے کے شاعروں اور عالموں کے نام تو بھلا دئے گئے ہیں لیکن بابا فرید گنج شکر اور ان کے مرید خاص نظام الدین اولیا کا نام آج بھی لاکوں کروڑوں انسانوں کے دلوں میں زندہ ہے ۔ یوں تو جنوبی ایشیا کے صوفیا کے بارے میں کتابوں کی کوئی کمی نہیں ہے مگر جو لوگ ان پر واقعی تحقیقی کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے مستند حوالے کچھ زیادہ موجود نہیں ہیں یا ان حوالوں تک ان کی رسائی نہیں ہے ۔ پروفیسر اینا نے اس کتاب میں جہاں اور اچھے کام کئے ہیں ان میں سب سے اچھا کام یہ ہے کہ

MashalBooks.org

اتنے بہت سے صوفیائے کرام کے احوال ایک ہی جگہ اکٹھے کر دئے ہیں ۔ یہ احوال آسانی سے اور کسی جگہ نہیں ملتے ۔مختلف صدیوں اور مختلف علاقوں کے ان تمام صوفیا کے احوال جمع کرنا ہی بڑی بات نہیں ہے بلکہ جس صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ احوال بیان کئے گئے ہیں وہ بھی مصنفہ کا ہی حصہ ہے ۔ یہ دلچسپ احوال جمع کرتے ہوئے مصنفہ نے قدرتی طور پر بیسویں صدی کے ممتاز لکھنے والوں کی تحریروں سے مدد لی ہے ۔ان لکھنے والوں میں نمایاں نام خلیق احمد نظامی ، بروس لارنس اور مرحومہ این میری شمل کے ہیں ۔کتابیات میں ان سب کا نام شامل کر لیا گیا ہے ۔

دوسرے محققین کا کام اکٹھا کرنا بھی اپنی جگہ اہم ہے۔لیکن اس کتاب میں اور بھی بہت کچھ ہے ۔مصنفہ کا ادبی ذوق اس بات سے ہی واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے ٹامس اکوئناس اور بورخیس جیسے بہت سے ادیبوں کے حوالے دئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جن صوفیائے کرام کا ذکر کیا ہے ان کی اپنی یا ان کے مریدوں کی شاعری کے حوالے بھی دئے ہیں ۔ ان میں سے اکثر اشعار فارسی زبان میں ہیں ۔ اور بر صغیر میں یہ زبان سمجھنے والے اب کم ہی رہ گئے ہیں ۔لیکن یہ اشعار کتنے اثر انگیز ہیں اس کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے جو امیر حسن کی تحریر کردہ نظام الدین اولیا کے سوانح حیات ''فوائد االفواد'' سے نقل کئے گئے ہیں ۔ ان صوفیائے کرام کے مزاروں اور درگاہوں کے بارے میں جو تفصیلات اس کتاب میں دی گئی ہیں قاری کے لئے وہ بھی معلومات کا خزانہ ہیں۔ یہ درگاہیں آج بھی مرجع خلائق ہیں ۔ اور انہوں نے ان بزرگوں کی یاد کو آج بھی زندہ رکھا ہوا ہے ۔مصنفہ نے ان مزاروں اور ان پر ہونے والی رسوم کا بہت باریک بینی سے ہمدردانہ مشاہدہ ہی کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہاں زائرین کو جو مشکلیں پیش آتی ہیں اور جو رسوم عام طور پر سمجھ میں نہیں آتی ہیں کتاب میں ان کا ذکر بھی کر دیا ہے ۔ یہ رسوم ان درگاہوں کی زیارت کا لازمی حصہ ہوتی ہیں ۔

جنوبی ایشیا کے اسلام کی جدید تفہیم کے لئے پروفیسر اینا سوودرووا نے اپنے موضوع کی مرکزیت کے ساتھ جس جذباتی لگاؤ کا اظہار اس کتاب میں کیا ہے اس سے اس حیرت انگیز موضوع پر ایک حیرت انگیز کتاب وجود میں آ گئی ہے ۔یہ کتاب جو پیغام دیتی ہے کہ اس کی ضرورت جتنی آج ہے اتنی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی ۔

MashalBooks.org

برصغیر میں مزار

پاک و ہند میں مقبروں کی کثرت نے آنے والے باہر سے آنے والے ہر سیاح کو مبہوت کیا ہے۔ یہ مقبرے عوام کی زیارت گاہ اور مرجع خلائق ہیں۔ برصغیر کے سندھ، پنجاب، گجرات اور دکن جیسے بعض حصوں میں تو قدم قدم پر ایسی درگاہیں موجود ہے۔ زمین کے بعض ٹکڑے تو مقدس مقبروں سے ہی گھرے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر عوام الناس کا یقین ہے کہ پاکستانی قصبے ٹھٹھہ کے نزدیک واقع مکلی کی پہاڑی پر سوالاکھ اولیا کے مقبرے ہیں۔

اٹھارہویں صدی کے سندھی مورخ (میر علی شیر قانی) نے اپنی کتاب مکلی نامہ کا انتساب اسی جگہ کے نام کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے، ''اس پہاڑی کی خاک صاحبان بصیرت کی آنکھوں کا سرمہ ہے اور اس کی مٹی مستور کے بیج کی کیاری ہے۔ (قانی 1967ء:11)

اسی طرح کا ایک اور مقام دکن میں شاہ پورہ کی پہاڑی ہے جہاں پندرہویں سے سترہویں صدی تک بہت سے شیوخ اور سید دفن کئے گئے۔ پنجاب میں اوچ شریف اور ملتان کو بھی کئی نامور صوفیا کے مدفن ہونے کا شرف حاصل ہے اور انہیں مقامات برکات کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی ریاست اتر پردیش کے مشرقی حصے کا بھی یہی حال ہے۔ یہ علاقے کبھی اودھ اور روہیل کھنڈ کی ریاستوں میں شامل تھے۔ عوام الناس سمجھتے ہیں کہ یہاں گیارہویں صدی میں سچے دین کے لئے اپنی جانیں دینے والے بزرگ ابدی نیند سوئے ہوئے ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلمان ہی وہ سماجی گروہ تھے جس میں اولیا اور ان کے مقابر سے وابستہ مسلک نے جنم لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل ہندوؤں میں نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ یہ لوگ اپنے مردوں کو دفنانے کی بجائے جلاتے تھے۔ ان کے ہاں اپنے اولیا کی اس طور تعظیم کی

MashalBooks.org

بنیاد ہی موجود نہیں تھی۔ لیکن صدیوں کی ہمسائیگی اور میل ملاپ میں برصغیر کی ان دو بڑی کمیونٹیوں نے ایک دوسرے کو متاثر کیا۔ ان اثرات کا ایک پہلو یہ تھا کہ ہندو بھی اولیا کے مسالک سے متاثر ہوئے اور ان میں بھی مقابر کی تعظیم راہ پا گئی۔

تاریخی ماخذوں سے پتہ چلتا ہے کہ معجزہ نما اور دین کے محافظ صوفی شیوخ کی باقیات کا احترام ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان کے تمام طبقوں میں پایا جاتا تھا اور اس میں سماجی مرتبے اور مذہب کی کوئی قید نہیں تھی۔ چنانچہ 1747ء میں افغان فاتح احمد شاہ ابدالی ہندوستان میں داخل ہوا تو کلہوڑا حکمرانوں کا ہندو دیوان گدومل اسکی خدمت میں پہنچا۔ وہ احمد شاہ ابدالی کی نذر کیلئے سندھ کے خزائن میں سے قیمتی ترین یعنی مقامی اولیا کے مقبروں کی مٹی سے بھری ایک تھیلی لیتا گیا(1)۔

پنجاب میں صوفی شیوخ کے بہت سے اشعار سکھوں کیلئے مقدس بن گئے۔ ان میں سے شیخ فریدالدین کا مقام بہت اونچا ہے جنہیں بابا فرید بھی کہتے ہیں۔ سکھوں کی مذہبی کتاب ''آدی گرنتھ'' میں بھی مسلم صوفیا کا کلام شامل ہے۔ صوفیا کے ساتھ محض دیگر بڑے مذاہب کے لوگ ہی وابستہ نہیں تھے بلکہ خوفناک دیوی بھوانی کے پجاری، ٹھگ اور انہی جیسے دیگر اقلیتی گروپوں کے لوگ بھی ان کے عقیدت مند تھے۔ اسطرح کے دیگر گروپوں میں میواتی، ہیجڑے اور بنجارے بھی آتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ صوفیا کے مسلک میں شرکت کیلئے کسی شخص کا متقی اور پرہیز گار مسلمان ہونا ضروری نہیں تھا۔ روائتی تمدن اور پسماندہ شعور کے حامل کسی بھی اور معاشرے کی طرح ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان میں بھی انسانی تمدنی کے خدوخال کا تعین مذہبی تصورات کے زیر اثر تھا۔ کم از کم مسلمانوں کیلئے قرآن و سنت اور اسلام بحثیت مجموعی زندگی کا ناگزیر جزو رہا۔ خارجی کائنات یعنی کائنات اکبر اور داخلی روحانی دنیا یعنی کائنات اصغر سب کلیتًا مذہبی تھے۔ اس طرز فکر نے ازمنہ وسطیٰ کے پورے سماج میں طاقتور اور بڑی شدت کے حامل ایمان کو جنم دیا تھا۔ اسلام کے محیط کل امور اور بالخصوص شرعی احکام نے مذہبی دائرہ کار سے باہر کسی سرگرمی کیلئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ سچے مومن کیلئے لازم تھا کہ پیدائش سے وفات تک اسکی زندگی کا ہر قدم ایمانی احکام کی مطابقت میں رہے۔

تاہم مذہب کے ساتھ شدید وابستگی کے اس سیر شدہ ماحول میں بھی ممکن نہیں تھا کہ

MashalBooks.org

مبنی بر اخلاص تقویٰ اور پرہیزگاری حیات کی مستقل کیفیت بن جائے۔ مذہبیت کے ایسے غیرمعمولی غلبے اور عقیدے پر اس درجہ ارتکاز کے ماحول میں مسلمہ راستے اور طریقے سے انحراف کرنے والے فرد اور معاشرتی گروہ نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہندوستان کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ اور تمدن کا مطالعہ کیا جائے تو اسلام کی روح اور اسکے واضح احکامات سے انحراف نظر آتا ہے۔ ظاہری تقوے اور اگلے جہان کی فکر کے پردے میں بدعت، بے ادبی اور دنیا داری صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ اس عدم مطابقت کی وجہ پر کافی تحقیقی کام ہوا ہے۔ تاریخیت کے حمائتی خیال کرتے ہیں کہ اس امر کو ازمنہ وسطیٰ کے ہندوستان میں سیکولر ازم کی طرف پہلا قدم سمجھنا چاہیئے۔ یہ خیال کچھ زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔ جب ہم برصغیر پاک وہند میں غیر متجانس آبادی کو دیکھتے ہیں تو نظریئے کی حقانیت اور بھی متنازعہ ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں آمد کے بعد اسلام کو کئی مذاہب کے ساتھ واسطہ پڑا۔ اول تو یہاں ہندوازم کی کئی شکلیں موجود تھیں۔ انکے ساتھ متعامل ہونے کے بعد اسلام میں نئے مذہبی تصورات نے جنم لیا۔ بالخصوص نچلے طبقاتس کے عوامی اسلام کا یہی حال تھا۔ اس اختلاط نے کئی مسلمان ماہر الٰہیات کو پریشان کیئے رکھا۔ وہ اسلام اور دیگر مذاہب کے تصورات کے اختلاط کو اسلام میں ملاوٹ قرار دیتے تھے۔ ان لوگوں کو بالعموم قدامت پسند کہا جاتا ہے۔ خیال رکھنا چاہیے کہ جب ہم اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں تو یہاں قدامت اور بدعت جیسے تصورات کی مسیحی شکل کا اطلاق اصل صورت میں نہیں ہوتا۔ اگر ان اصطلاحات کو اسلام کیلیئے استعمال کرنا ہے تو انہیں ایک نئی وضاحت درکار ہو گی۔

اسلامی تاریخ میں تمام مسلمان کسی ایک الٰہیاتی مکتبہ فکر پر متحد نہیں رہے اور نہ آج ہیں۔ عالم اسلام میں عقائد کو باقاعدہ، منضبط اور قانونی حیثیت دینے والا کوئی ادارہ موجود نہیں رہا۔ مذہبی اصولوں کی تعبیر اور وضاحت خلیفہ، سلطان اور روحانی اداروں کے احاطہء کار سے الگ رہی۔ مذکورہ بالا قدامت پسندوں کی آرا بھی فقہا کا نجی فیصلہ تھا اور اسے کوئی ریاستی پشت پناہی میسر نہیں تھی۔ انہیں فقط اپنے ذاتی علم کے بل بوتے پر تعبیر اور تشریح کا مشکل کام خالصتاً ذاتی اور نجی سطح پر کرنا پڑا۔

مفتی، قاضی، امام، فقیہہ اور مجتہد جیسے سرکاری عہدوں پر فائز عالم بھی یہ کام کرتے رہے لیکن انکے فیصلوں کو بھی بالعموم ریاستی پشت پناہی میسر نہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بطور

MashalBooks.org

فلسفی اور صوفی لوگ انہیں اس کام کا اہل سمجھتے تھے۔ کبھی کبھار یہ بھی ہوتا کہ خلیفہ، سلطان یا بادشاہ ان میں سے کسی شخص اور اسکے مکتبہ فکر کو تسلیم کر لیتا۔ یوں ریاست میں اس تعبیر کو سرکاری سرپرستی مل جاتی لیکن یہ امر زمان و مکان میں نہایت محدود تھا جغرافیائی حدود سے باہر موجود امت مسلمہ کا خیال نہ رکھا جاتا۔ چنانچہ کسی بھی مسئلے کی تعبیر میں اختلاف کا پیدا ہو جانا عین یقینی تھا۔ اس نوعیت کے اختلافات اسلام کے خصائص میں داخل ہو چکے ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے تو یہاں امام ابو حنیفہ کے حنفی سنی مکتب فکر یا مذہب کا غلبہ رہا ہے۔ یہی وہ مذہب تھا جسے سلطنت دہلی کے سلطانوں اور مغل بادشاہوں نے اپنایا تھا۔ چنانچہ حنفی مذہب کو، بعض مخصوص شرائط کے تحت، برصغیر کا سرکاری مذہب قرار دیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ برصغیر کے سنی مسلمانوں نے زہد واتقا سے قدرے انحراف کیا لیکن انہیں کسی بھی طرح زندیق نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں البتہ اسماعیلیوں، مہدویوں، روشنائیوں اور سرمد جیسے کچھ صوفیوں کو چھوڑ کر ریاست کی مذہبی بنیادوں کے ساتھ متصادم ہونے والے عناصر کو کافر اور سچے ایمان کے دشمن قرار دیا گیا۔

واضح رہے کہ مذکورہ بالا زندیقوں (2) سے مذہب کی بالادستی کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ البتہ ان لوگوں کو ریاست کیلئے خطرہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اسماعیلی ہمیشہ ریاستی عتاب کا شکار رہے اور انہوں نے بھی باغیوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کرنے کا عمل جاری رکھا۔ اسکی ایک مثال دہلی میں قرامطیوں کی بغاوت ہے جو 1236ء میں نوری ترک کی زیر قیادت برپا ہوئی۔ برصغیر میں مغلوں کے خلاف مسلح جدوجہد کرنے والوں میں سے روشنائی سلسلے کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں آباد پشتو خواں قبائل میں مغلوں کے خلاف کامیاب پروپیگنڈہ کیا۔ شاہ عنایت نے سندھی کاشت کاروں کو تحریک دی کہ وہ سرکاری محصول ادا نہ کریں اور زمیندار امرا سے زمین چھین لیں۔ شیخ سرمد نے تخت نشینی کی جنگ میں اورنگ زیب کے خلاف دارا شکوہ کا ساتھ دیا۔

ہندو مسلمان ثقافتی ڈائیلاگ کا آغاز صوفیوں اور اسلام کے مبلغوں نے کیا۔ ان لوگوں نے بارہویں سے چودہویں صدی تک تبلیغی عمل کو موثر بنانے کیلئے مقامی مذاہب کی اساطیر اور تمدنی روایات کا بغور مطالعہ کیا۔ یوں اسلام اور ویدانت کے درمیان ایک تعلق

MashalBooks.org

قائم ہوا۔ اسی طرح کا تعلق صوفیوں کی تبلیغ اور ناتھوں، سنتوں اور بھگتوں کی تعلیمات کے مابین بھی موجود تھا۔

یہی وجہ ہے کہ پندرہویں صدی کے آتے آتے برصغیر کے کئی حصوں میں مختلف الانواع مذہبی تصورات کے باہمی تعامل سے وجود میں آنے والا کلچر صاف نظر آنے لگا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تالیف سے جنم لینے والا یہ کلچر عوام الناس کی سطح پر زیادہ طاقتور تھا۔ بالخصوص کشمیر، پنجاب، سندھ، گجرات، دکن اور گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے میں اس تمدن نے مذاہب کے درمیان امن کو جنم دیا۔ مغلوں اور سلاطین دہلی کے زمانے میں سماجی اور سیاسی وحدت بھی اسی ہندو مسلم تمدن کی پیداوار تھی۔ اگرچہ سچے اور خالص عقائد کی حفاظت بادشاہوں کی ذمہ داری سمجھی جاتی تھی لیکن انہوں نے بھی مخصوص مراحل پر صوفیانہ بھائی چارے اور اس سے پیدا ہونے والی تالیف کو ترجیح دی۔ بالفاظ دیگر ان بادشاہوں کے نزدیک مذہبی تخلیص سے زیادہ اہمیت ریاستی سیاسی وحدت کو حاصل تھی۔

بادشاہوں کے مذکورہ بالا رویے عین قابل فہم ہیں۔ سلطنتیں اور حکومتیں اسی رویے کی بنیاد پر قائم رہ سکتی تھیں۔ اپنے سے کئی گنا زیادہ آبادی پر حکومت کرنے کیلئے لچکدار انداز فکر ناگزیر تھا۔ مذاہب کی اسی تالیف کے باعث مذہبی امن اور سیاسی سماجی استحکام ممکن ہو پایا۔ بیسویں صدی کے ہندوستانی مورخین اکثر و بیشتر قرار دیتے ہیں کہ یہ ثقافتی اور تمدنی تالیف شعوری سطح پر ہونے والی کاوش کا نتیجہ تھی۔ یہ بات صرف جزواً درست ہے۔ زیادہ تر معاملات میں دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ چیزوں کو اسلامیانے کی سطحی کوششوں کی ذیلی پیداوار ہے۔ اپنی اصل میں یہ اسلام کے اندر قبل اسلام عقائد و تصورات کے لیئے جگہ بنانے کی کوششوں کا حاصل بھی ہے۔

بہت کم ایسا ہوا کہ بالائی سماجی طبقات اور ممتاز دانشوروں نے اسے بطور پالیسی اپنایا۔ اس تالیف کے حوالے سے جدید مورخین کے ہاں بھی بڑے نازک پہلو سامنے آتے ہیں۔ ہندو مسلم تالیف کی تائید کرنے والے حکمرانوں میں سے جونپور کا سلطان ابراہیم شرقی، کشمیر کا سلطان زین العابدین، بیجاپور کا عادل شاہ اور گولکنڈہ کا قلی قطب شاہ زیادہ معروف ہیں۔ گجرات کے حکمران محمود بیگڑہ اور مغل بادشاہ اکبر کو بھی اس صف میں رکھا جا سکتا ہے۔ تالیفی عمل کے حوالے سے منفی کردار ادا کرنے والوں میں سے مبارک شاہ خلجی،

غیاث الدین تغلق، محمد تغلق، فیروز شاہ تغلق، سکندر لودھی اور اورنگزیب زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ان لوگوں نے بنیاد پرستی کا رویہ اختیار کیا۔

اگر ہمیں تالیف کی تفہیم خالص مذہبی مسئلہ کے طور پر کرنا ہے تو دو باتیں بہت اہم ہیں۔ہمیں ماضی بعید یعنی از منہ وسطیٰ کے ہندوستان کے لیے ایک بہتر معاشرت کا تعین کرنے میں آج کے معاشرتی علوم کا اطلاق نہیں کرنا چاہیے۔مختصراً یہ کہ تالیف کے مسئلہ کو اس کے سماجی سیاسی تناظر سے الگ کرنے کے بعد دیکھنا ہوگا۔ یوں ہمیں ہندوستانی ثقافتی منظر کے کئی ٹکڑے انتہائی مختلف انداز میں نظر آئیں ہے۔

کسی مخصوص مذہب کے مشمولات سے قطع نظر بحیثیت مجموعی مذہبی زندگی بے لگام تغیر کا شکار تھی۔ اس امر کا اطلاق بالخصوص صوفیاء پر ہوتا ہے۔ صوفیا کے مسالک کو ہندوستان کی مٹی راس آئی۔ ان مسالک پر ایک نیا جوبن آیا اور وہ بے حدوحساب پھیلنے لگے۔ انہی شیخوں، سیدوں اور پیروں کے حلقہ ارادت میں ہندومسلم تالیف نے اسلام کے بنیادی اصولوں کو چیلنج سے دوچار کر دیا۔

عیسائیت کے برعکس مسلمانوں میں ولائت کی تصدیق کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔ کسی حقیقی شخصیت، داستانوی کردار یا عوامی ہیرو کو ولی منوانے کے لیے مسلم عامتہ الناس کی راہے ہی کافی تھی۔ مذہبی مقتدرہ کو جلد یا بدیر اس ارادت کو ماننا اور اسے اسلامی عمومی اصولوں کی مطابقت میں لانا ہوتا تھا(3)۔ جب اس طرح کا عمل سماج کے نچلے طبقوں میں ہوتا تھا تو اولیاء کی ارادت میں ایسے خصائص درکر آتے جن کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس پر ماہرین الٰہیات شدید احتجاج کرتے تھے۔

یہ لوگ سمجھتے تھے ایک سچے مومن کے قلب کا ہر ہر ارتعاش اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہونا چاہیے جبکہ صوفیا کی ارادت اس جذبے کو رنگارنگ ٹکڑوں میں بانٹ دیتی ہے۔جن کا اسلامی اصولوں اور عبارتوں سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ اگر مذہب حیات کے تمام شعبوں میں سرایت کر جاتا ہے تو فقط دنیادار پر ہی روحانیت غالب نہیں آئے گی بلکہ اہل روحانیت بھی دنیا دار ہو جائیں گے۔ اسلام قبول کرنے والوں میں سے زیادہ تر سماج کے نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ انکا شعور کچھ زیادہ تر اشیدہ اور تربیت یافتہ نہیں تھا۔ انہوں نے اسلام لانے کے بعد اپنے اپنے پسندیدہ اولیا کے ساتھ کچھ مخصوص اوصاف

MashalBooks.org

وابستہ کر لیئے۔ چونکہ اولیا کی موت شہادت تھی اور لوگوں کے جہان تخیل ان کے معجزوں سے آباد تھے چنانچہ انکا مدد کیلیئے اولیا سے رجوع کرنا عین قابل فہم ہے۔کم ازکم ایک غیر مرئی اور انسانی خصائص سے تہی خدا کے مقابلے میں ان اولیا کے ساتھ وابستگی اور ارادت زیادہ قابل فہم ہے۔

زندہ صوفی کو زیادہ بڑا حلقہ ارادت بہت کم میسر آیا۔لوگوں نے تقریباً ہمیشہ کسی نہ کسی مقبرے کو ارادت کا مرکز ومحور بنایا۔اس مقبرے میں ولی کا جسد خاکی دفن ہوتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسکی فانی زندگی کی اشیاء لباس، پگڑی، جوتے، عصا، ہتھیار اور تسبیح جیسی باقیات بھی رکھی جاتی ہیں جنہیں تبرکات کہا جاتا ہے۔ مادی اشیا کے ساتھ اسطرح کی وابستگی روحانی پہلوؤں پر کسی خاص طرح کا مادی جسمانی اثر لازمی طور پر مرتب کرے گی ۔غیر متوقع انتہا پسندانہ رویے اس لیئے سامنے آتے ہیں۔

اسلام میں ساحری منع کی گئی ہے جبکہ معاشرے کے نچلے اور متوسط طبقات میں مقبول مذہب کی ساخت میں ساحری شامل ہے۔ اولیا کی باقیات سے ارادت بھی اسی کا ایک جزو ہے۔ یہ دونوں امور اولیا کے متعلق تصورات میں ایک خاص طرح کی مادیت شامل کر دیتے ہیں(4)۔ اسطرح کی جسمانی باقیات کے ساتھ ارادت کی معروف مثال مختلف جگہ پر پیغمبر ﷺ کے نقش پا اور موئے مبارک کی موجودگی ہے۔بعض دیگر جگہوں پر انکے اہل بیت کی جسمانی باقیات کے موجود ہونے کا بھی یقین کیا جاتا ہے۔ ان باقیات کو مقبروں جیسی عمارتوں میں رکھا گیا ہے۔ روہڑی میں واقع وال (بال) مبارک اور حضرت بل، سری نگر، میں رسول ﷺ کے بال محفوظ ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نبی گنج، ڈھاکہ اور لکھنو میں قدوم رسول پر بہت بڑی بڑی یادگاریں بنائی گئی ہیں۔ ان بالوں کے متعلق کہا گیا کہ یہ ازخود بڑھتے رہتے ہیں۔اسلامی میں صوفی مسالک کے مطالعے کے بانی اگناز گولڈزیہر(Ignaz Goldziher) نے عبدالغنی نابلوسی نامی ایک عرب سیاح کے حوالے سے حج پر جانے والے ایک ہندوستانی مسلمان کا بیان درج کیا ہے کہ

''ہندوستان میں کئی لوگوں کے پاس رسول اللہ ﷺ کے بال موجود ہیں۔کسی کے پاس ایک، کسی کے پاس دو اور کسی کے پاس بیس بال موجود ہیں۔ یہ بال بعض اوقات ازخود حرکت کرتے ہیں اور نہ صرف انکی لمبائی بڑھتی ہے بلکہ یہ تعداد میں بھی یوں بڑھتے

MashalBooks.org

ہیں کہ فقط ایک بال سے بے شمار نئے بال بن جاتے ہیں(5)۔'' گولڈزیہر(1971ء۔ 1967ء)

ان باقیات کی ارادت نے مساجد کے متعلق رویے پر بھی اثر ڈالا ہے۔ لاہور کی بادشاہی مسجد میں بہت سے تبرکات موجود ہیں۔ مفروضہ ہے کہ انہیں بابر اپنے ساتھ ہندوستان لایا۔ ان تبرکات کا تعلق پیغمبرﷺ، حضرت علیؓ، اہل بیت اور عبدالقادر جیلانی سے ہے۔ مغل سلطنت کو زوال آیا تو یہ تبرکات سکھوں کے ہاتھ لگے اور پھر انگریزوں کے قبضے میں آئے تو مسجد میں رکھوا دیے گئے۔ کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں تبرکات کی اچھی خاصی مارکیٹ موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہاں بیشتر مال اصلی نہیں۔ 1873ء میں آیات قرآنی سے مرصع رسولﷺ کی ایک قمیض ہندوستان کے وائسرائے کو پیش کی گئی۔ آخر میں کھلا کہ ایک انگریز جنرل نے اسے کلکتہ کے بازار سے دس ہزار روپے میں خریدا تھا۔

کم از کم تبرک کے حصول کے لئے ازمنہ وسطیٰ کا ذہن نہ کسی جرم سے چوکتا تھا اور نہ ہی بے ادبی سے۔ ہندوستان کی 1911ء کی مردم شماری میں اس امر کی ایک ظالمانہ مثال ملتی ہے۔ تیرہ (Tirah) کے آفریدی پٹھانوں کے ہاں ولی کا ایک مقبرہ بھی نہیں تھا کہ باعث برکت اور مرجع خلائق ہوتا۔ اجتماعی احساس کمتری کا شکار ہوکر ''آفریدیوں نے نہایت فراخ دلانہ پیشکشوں کے ذریعے ایک نہایت معروف ولی کو اپنے ہاں بسنے پر آمادہ کرلیا۔ پھر اس قیام کو ہمیشگی دینے کیلئے انہوں نے ولی کا گلا کاٹ دیا اور اسے نہایت عزت و احترام سے دفن کیا گیا اور مدفن پر ایک شاندار خانقاہ تعمیر ہوئی تاکہ وہ انکی معاونت کرے اور خدا کے حضور انکی دعائیں پہنچائے۔''(شمل: 1980ء)

یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں بھی ایسی ہی ایک مثال ملتی ہے۔ ''گیارہویں صدی کے اطالوی کسان سینٹ رومالڈ(St.Romuald) کو قتل کرنا چاہتے تھے تاکہ اسکی باقیات پر قبضہ کرسکیں۔'' (Huizinga 1995ء)

بعد ازاں صوفیا کے مسالک باقاعدہ متشکل ہوئے تو تبرکات کی جگہ تعویذوں نے لے لی جنہیں دفع شر، مختلف بیماریوں کے علاج اور ولی کی مافوق الفطرت قوتوں کی تجسیم